1 تعارف :

مثنوی اردو شاعری کی ایک اہم صنف ہے ہیئت کے اعتبار سے ایسے ہم وزن اشعار کے مجموعہ کو مثنوی کہا جاتا ہے جس میں ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں اور ہر شعر اپنے پہلے اور بعد کے شعر سے مختلف قافیہ رکھتا ہو۔

لفظ ''ثنی'' عربی زبان کے لفظ مثنوی سے مشتق ہے جس کا مطلب دو دو علاحدہ کرنا ہے چونکہ صنف مثنوی کا ہر شعر اپنے سے پہلے اور بعد کے اشعار سے علاحدہ دو قافیوں کا حامل ہوتا ہے اس لیے اس صنف کو مثنوی کا نام دیا گیا ہے۔ مثنوی کی ہیئت کا خاکہ حسب ذیل ہے:۔

ب-----------ب----------

ج----------ج-----------

د----------د------------

ف---------ف-----------

مثنوی اردو شاعری کی ایک بیانیہ اور توضیحی صنف ہے اس میں شاعر اپنے کسی خیال یا مقصد کو یا تو راست طور پر بیانیہ انداز میں نظم کر دیتا ہے یا کسی داستان یا قصے کے روپ میں پیش کرتا ہے۔

سیدھے سادے بیانیہ انداز میں قلمبند کی جانے والی مثنویاں اکثر کسی مخصوص موضوع پر لکھی جاتی ہیں ایسی مثنویاں عموماً مختصر ہوتی ہیں مثلاً میر کی ''مثنوی در بیان ہولی'' ''مثنوی در تعریف آغا رشید خطاط'' حالی'' کی '' برکھا رت'' داستان یا قصے کی صورت میں بیان ہونے والی مثنویاں عموماً طویل ہوتی ہیں اور ان میں قصہ گوئی کے تمام اجزا پائے جاتے ہیں اس کے علاوہ ان کی تشکیل میں با قاعدہ ایک خاص ترتیب کو برتا جاتا ہے۔

ان میں سب سے پہلے ''حمد'' لکھی جاتی ہے۔ پھر نعت رسول ، اس کے بعد '' مدح فرماں روائے وقت'' کے عنوان سے اپنے زمانے کے بادشاہ یا کسی وزیر یا رئیس کی تعریف بیان کی جاتی ہے بعد میں شاعر کبھی کبھی '' تعریف سخن'' کا حصہ بھی شامل کرتا ہے جس میں وہ

[illegible]

کرتا ہے۔جس کے باعث یہ حصہ نہایت اہمیت کا حامل بن جاتا ہے۔

کبھی کبھی مثنوی قلمبند کرنے کے مقصد پر بھی ''سبب تصنیف'' کے عنوان سے روشنی ڈالی جاتی ہے۔

یہ تمام حصے درحقیقت تمہید کی حیثیت رکھتے ہیں، اس کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے۔تقریباً تمام داستانوی مثنویوں میں مثنوی کے اجزائے ترکیبی کی یہی ترتیب ملتی ہے، خصوصاً قدیم اردو مثنویاں اسی نہج پر لکھی گئی ہیں۔

ویسے بعض مثنوی نگاران اجزاء میں سے کسی جز کو نظرانداز کردیتے ہیں یا اپنی پسند کے مطابق ان ترتیب میں ردو بدل بھی کرلیتے ہیں۔

2 اجزائے ترکیبی :

مثنوی میں قصہ گوئی کے تمام اجزائے ترکیبی یعنی پلاٹ، کردار نگاری، جذبات نگاری، سراپا نگاری، مکالمہ نگاری اور منظر نگاری، جزئیات نگاری سبھی پہلو پائے جاتے ہیں۔ان کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔

پلاٹ :۔کسی بھی کہانی میں واقعات کی ترتیب کو پلاٹ کہا جاتا ہے۔مثنوی کے قصے میں بھی پلاٹ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔عموماً مثنویوں کے پلاٹ سادہ ہوتے ہیں اور قصہ ابتداء اور ارتقاء کی منزلوں سے گزرتا ہوا اختتام کو پہنچ جاتا ہے۔

کردار نگاری:۔کردار کہانی کا اہم حصہ ہوتے ہیں۔اردو مثنویوں کے قصوں میں عام طور پر بادشاہ شہزادے، شہزادیاں، وزیرزادے، مامائیں، کنیزیں، جادوگر، نجومی اور دیو، جن اور پری جیسے کردار ملتے ہیں قدیم مثنویوں میں فوق الفطری ہستیوں کو بڑی اہمیت دی گئی ہے،

فوق الفطری کردار مختلف حیوانی یا انسانی شکلیں اختیار کرکے انسان سے اپنی من مانی کروانے کی کوشش کرتے ہیں۔ایک شکل سے دوسری شکل میں تبدیل ہوجانے کی قدرت بھی ان میں پائی جاتی ہے۔اکثر کسی دیو یا بھوت کی جان کسی مقام پر پنجرے میں بند مینا یا طوطے کے قبضے میں ہوتی ہے جس کو مارڈالنے کے بعد انسان کو دیو سے رہائی حاصل ہوسکتی ہے۔قدیم مثنویوں میں ان کرداروں کی شرکت اس بات کی دلیل ہے کہ اس وقت کا انسانی ذہن ان دیکھی قوتوں کے وجود پر گہرا اعتقاد رکھتا تھا۔

انسانی کردار مثنوی نگاروں کے اپنے وقت کی تہذیبی اور معاشرتی قدروں کے حامل ہوتے ہیں، کہانی چاہے کوئی بھی ہو، کردار کے طور طریقے، عادات واطوار، اعمال واخلاق رہن سہن اور لباس وگفتگو وغیرہ مثنوی نگار کے ماحول اور زمانے کی آئینہ داری کرتے ہیں۔

جذبات نگاری:۔مثنوی نگار کرداروں کے جذبات کے تمام باریکیوں کو اپنے پیش نظر رکھتا ہے۔جب وہ کرداروں کی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے، ان کی داخلی کیفیات، نفسیاتی الجھنوں اور عمل ورد عمل کی کڑیوں کو نمایاں کرنے اور سلجھانے میں مہارت اور واقفیت کو کافی دخل ہوتا ہے۔قدیم اردو کی مثنویوں مثلاً غواصی کی مثنوی مینا ستونتی، نصرتی کی گلشن عشق میں پھر میر حسن کی سحرالبیان میں اور میر کی دریائے شوق وغیرہ میں جذبات نگاری کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔

مکالمہ نگاری :۔ مکالمہ نگاری داستانوی مثنویوں کی کامیابی کا ایک اہم پہلو ...

مثنوی نگارون نے ایک زمانے تک انھیں بحروں میں مذکورہ بالا مثنویاں لکھی ہیں۔لیکن بعد میں شعرانے اس روایت سے بغاوت شروع کر دی مثلاً میر حسن نے عشقیہ مثنوی ''سحر البیان'' جو رزمیہ مثنویوں کے لیے استعمال کی جانے والی بحر کا استعمال کیا اور اپنی جادو بیانی کا سکہ بٹھا دیا۔ان کے علاوہ حفیظ جالندھری نے ہزج مثمن سالمہ میں اپنی مثنوی ''شاہنامہ اسلام'' لکھ کر ادب میں نمایاں مقام حاصل کر لیا ،ان مثنویوں میں موضوع کی اہمیت کے علاوہ بحروں کے جدت پسندانہ انتخاب نے بھی اہم رول ادا کیا۔

5 اہمیت وافادیت :

موضوع کی آزادی اور ہیئت اور ساخت کی سہولیات کے باعث مثنوی دوسری صنف سخن کے مقابلے زیادہ اہمیت اور افادیت کی حامل سمجھی جانے لگی۔مولانا حالی نے مقدمہ شعروشاعری میں لکھا ہے:

الغرض جتنی صنفیں فارسی اور اردو شاعری میں متداول ہیں ان میں کوئی صنف مسلسل مضامین بیان کرنے کے قابل مثنوی سے بہتر نہیں ہے۔ یہ وہ صنف ہے جس کی وجہ سے فارسی شاعری کو عرب کی شاعری پر ترجیح دی جاسکتی ہے.....

اردو کی شاعری کی تمام اصناف میں سب زیادہ کارآمد یہ صنف ہے، کیونکہ غزل یا قصیدہ میں اس وجہ سے کہ اول سے آخر تک ایک ایک قافیے کی پابندی ہوتی ہے ہر قسم کے مسلسل مضامین کی گنجائش نہیں ہوسکتی.....''

اسی طرح مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں:۔

''انواع شاعری میں یہ صنف تمام انواع شاعری کی بہ نسبت زیادہ مفید۔زیادہ وسیع اور زیادہ ہمہ گیر ہے۔شاعری کے جس قدر انواع ہیں سب اس میں نہایت خوبی سے ادا ہو سکتے ہیں۔جذبات انسانی، مناظر قدرت۔واقعہ نگاری، تخئیل ان تمام چیزوں کے لیے مثنوی سے زیادہ کوئی میدان ہاتھ نہیں آسکتا.....''

اردو کے اولین نقاد مولانا حالؔی نے معیاری مثنویوں کی تخلیق کے سلسلے میں مشورہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ جو قصہ مثنوی میں بیان کیا جائے اس کی بنیاد ناممکن اور فوق العادات باتوں پر نہ رکھی جائے ،ربط کلام کا لحاظ رکھا جائے خاص کر جب کہ اس میں تاریخ یا قصہ بیان ہو رہا ہو مبالغے کا استعمال صرف وہاں تک کیا جائے جہاں تک عقل انسانی میں وہ مبالغہ آجائے اور شعر تماشہ یا پہیلی نہ بن جائے ،بیان مقتضائے حال کے موافق اور نیچرل ہونا چاہیے اس بات کا بھی خاص طور سے خیال رکھنا چاہیے کہ ایک بیان دوسرے کی تکذیب نہ کرے،قصہ کے ضمن میں کوئی ایسی بات نہ آجائے جو مشاہدہ یا تجربہ کے خلاف ہو۔

اردو میں بہمنی دور کے شاعر فخر الدین نظامؔی بیدری کی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' سے صنف مثنوی کی ابتداء ہوئی، نظامؔی نے اسے بہمنی سلطنت کے نویں بادشاہ احمد شاہ ولی بہمنی کے زمانے میں 825ھ سے 838ھ بمطابق 1421ء تا 1434ء لکھا تھا۔ اس میں فارسی بحر میں ہندوی زبان میں ایک عشقیہ قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد بابا فرید گنج شکر (864ھ) اور عبدالقدوس گنگوہی (860ھ تا 945ھ) کے ملفوظات مثنوی کی شکل میں دستیاب ہوتے ہیں۔ نویں صدی ہجری کے آخر میں قطبنؔ کا لکھا ہوا ایک قصہ ''مرگاوتی'' بھی ملتا ہے۔

ان ابتدائی نمونوں کے بعد دسویں صدی ہجری میں گجرات اور دکن کے بیجاپور اور گولکنڈا کے علاقوں میں مثنوی کو بے انتہا ترقی دی گئی۔ 986ھ میں گجرات کے صوفی بزرگ خوب محمد چشتی کی مثنوی ''خوب ترنگ'' ایک اہم طویل مثنوی ہے۔ ان کے علاوہ 902ھ میں وفات پانے والے حضرت میرانجی شمس العشاق کی چند مثنویاں جیسے خوش نغز، خوش نامہ، شرح مرغوب القلوب وغیرہ خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

897ھ میں بیجاپور کی سلطنت کے وجود میں آنے کے بعد ابراہیم عادل شاہ کے دور (۹۸۸ھ) سے مذہب، تصوف، فقہ، عقائد، جنگ وجدل اور عشق و عاشقی کے موضوعات پر مبنی مثنویوں کی تخلیق کا ایک طویل سلسلہ جاری ہو گیا۔

999ھ میں حضرت میراں جؔی کے فرزند حضرت جانؔم نے فارسی کی بحروں کو اپنا کر ''منفعت الایمان'' ''وصیت الہادی'' اور طویل مثنوی ''ارشانامہ'' کے علاوہ اور بھی کئی مثنویاں لکھیں جن کا موضوع خالص تصوف تھا۔

بیجاپور میں ابراہیم عادل شاہ (988ھ۔ 8037) کے دور میں مقیمؔی نے دو عشقیہ مثنویاں ''چندر بدن ومہار'' اور ''سومہار کی کہانی'' لکھیں۔ چندر بدن طبعزاد مثنوی تھی اور مقیمی کے مطابق شاہی سلطنت کے مشہور شاعر غواصؔی کے مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال سے متاثر ہو کر اس نے یہ مثنوی لکھی تھی، اس عجیب وغریب قصے کو ایک طویل مدت تک ذوق وشوق سے پڑھا جاتا رہا اور لازوال شہرت ملی، مقیمی کے معاصر شاعر نے ''بہرام وحسن بانو لکھی لیکن اس کی تکمیل نہ کر پایا، دولتؔ نے اسے مکمل کیا۔

محمد عادل شاہ (1037 تا 1067ھ) کے عہد میں صنعتؔی نے حضرت تمیم انصاری کی مہمات کے بیان پر مشتمل مثنوی ''قصہ بے نظیر'' لکھی، کمال خان رستمی نے فارسی کی مثنوی ''خاور نامہ'' کو اردو کا جامہ پہنایا، اسی دور میں ملک خوشنود نے ''ہشت بہشت'' اور ''یوسف و زلیخا'' مثنویاں لکھیں، علی عادل شاہ کے دربار کے ملک الشعراء ملا نصرتؔی کو تو مثنوی نگاری میں نہایت بلند مرتبہ حاصل تھا، اس نے رزمیہ اور عشقیہ دونوں قسم کی مثنویوں میں مہارت دکھائی ''علی نامہ'' نصرتی کی شہکار رزمیہ مثنوی ہے۔ جس میں علی عادل شاہ، مغلوں اور شیواجی کی باہمی جنگوں کے مرقعے پیش کیے گئے ہیں۔ اس دور میں شاہ ملک نے مثنوی ''احکام الصلوۃ'' لکھی حضرت امین الدین علی اعلی نے کئی تصوفانہ مثنویاں لکھیں، ہاشمی نے ایک طویل مثنوی ''یوسف زلیخا'' عنوان سے لکھی۔ قطب شاہی دور میں کئی شعراء نے مثنوی میں نام پیدا کیا۔ محمد قلی قطب شاہ کے درباری شاعر وجہی نے عشقیہ مثنوی قطب مشتری لکھ کر لافانی شہرت حاصل کی۔ محمد قطب شاہ (1020۔1035) کے زمانے میں حسن شوقی نے رزمیہ مثنوی ''ظفر نامہ'' لکھی۔ عبداللہ قطب شاہ (1035۔1083) کے عہد حکومت میں مثنوی کا فروغ و عروج

پر پہنچ گیا اسی دور میں غواصی نے سیف الملوک و بدیع الجمال، مثنوی لکھی جو الف لیلی کے قصے سے ماخوذ تھی، غواصی کی دو اور مثنویاں مینا ستو ستی اور طوطی نامہ ملتی ہیں۔ یہ تمام مثنویاں اس فن کی روایت کو سنوارنے، سجانے اور آگے بڑھانے میں نمایاں حصہ ادا کرتی ہیں، ابن نشاطی کی مشہور مثنوی ''پھول بن'' (1076ھ) بھی گولکنڈہ کی ناقابل فراموش مثنوی ہے۔ اس کے بعد ابوالحسن تانا شاہ کے دور میں فائز اور لطیف نے مثنویاں لکھیں۔

گولکنڈہ کے آخری بادشاہ سکندر عادل شاہ کے عہد میں ادب کی سرپرستی رک گئی تو وہاں کے شعرا ویلور، ارکاٹ اور اورنگ آباد وغیرہ مقامات کی طرف کوچ کر گئے۔ ان میں سے کئی شعرا نے مثنوی کی روایت کو برقرار رکھا ان میں سے ولی ویلوری، سراج اورنگ آبادی کی مثنویاں بھی مشہور ہیں۔

اورنگ زیب کے دکن کو فتح کر لینے کے بعد جب ولیؔ اورنگ آبادی دلی پہنچتے ہیں وہاں ریختہ گوئی کا چرچا زور پکڑنے لگتا ہے تو وہاں کے شعراء بھی مثنویاں لکھنے میں آگے نکل جاتے ہیں ادھر دکن میں دنیا سے سیر ہو کر شعراء مذہب اور تصوف کی طرف زیادہ مائل نظر آتے ہیں۔ بحری کی ''من لگن'' وجدی کی ''پنچھی باچھا'' اور عشرتی کی ''دیپک پتنگ'' اس زمانے کی مشہور مثنویاں ہیں۔

عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کے زوال کے بعد ٹیپو سلطان کے عہد اور عہد آصف جاہی میں مثنویوں کا ایک بڑا ذخیرہ ملتا ہے اس میں چھوٹی چھوٹی مذہبی مثنویوں سے لے کر انتہائی طویل مثنویاں بھی ملتی ہیں۔ جن میں تاریخی، سوانحی، عشقیہ، رزمیہ اور بزمیہ موضوعات کو اپنایا گیا ہے۔

1750ء میں دو سو چوبیس سالہ مغلیہ سلطنت کے قدم اکھڑ گئے تو اس کے بعد دلی میں زندگی بسر کرنا شعراء کے لیے بے حد مشکل تھا، وہ اودھ کی نسبتاً پرامن سانس لینے کے لئے لکھنو اور اس کے اطراف واکناف کو ہجرت کر گئے۔ ایسے میں کوئی طویل قابل قدر مثنوی تصنیف نہیں ہو پائی، دور قدیم کے شعراء حاتمؔ، فائز، آبرو، خاں آرزو وغیرہ نے غزلوں کو اہمیت دی۔ فائز نے مناجات، تعریف پنگھٹ اور تعریف جوگن جیسی مختصر مثنویاں لکھیں جن میں ہندوستان کے پھولوں اور پھلوں کو تشبیہوں اور استعاروں کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

فائز کے بعد میرؔ اور سوداؔ نے جو کہ دور متوسطین کے شعراء میں سے تھے اپنے سے پہلے کی مثنویوں میں موجود زبان و بیاں کی خامیوں کو دور کر کے زبان میں نکھار اور بیان میں نزاکت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ میر کی مثنوی ''دریائے عشق'' اور ''ہجو در خانۂ خود'' کافی مشہور مثنویاں ہیں اسی طرح سودا کی ''مثنوی در پیل راجہ نرپت سنگھ'' اور ''در ہجو شیدی فولاد خاں کوتوال'' کو بھی شہرت حاصل رہی ہے۔ سودا نے دو مکتوباتی مثنویاں لکھیں جو ''خط در شکایت'' اور ''خط در اشتیاق'' ہیں میرؔ کے شکار نامے جو مثنوی کے پیرائے میں موجود ہیں نواب آصف الدولہ کے شکار کھیلنے، موسم اور جنگل کی سحر کاری کے چھانے اور جانوروں کے بھاگنے کی جاندار عکاسی کرتے ہیں۔

اسی دور میں میر حسن نے 1784ء میں مثنوی ''سحر البیان'' قلمبند کر کے لافانی شہرت حاصل کر لی۔ ان کے علاوہ انشاء، مصحفی،

۔مرزا شوق کی مثنوی زہر عشق بھی لا فانی شہرت کی مالک ہے سحر البیان کی ٹکر پر لکھی گئی دبستان لکھنو کی مشہور زمانہ مثنوی ''گلزار نسیم'' ایک اور شہرت یافتہ مثنوی ہے جس میں زبان و بیان کی خوبیاں ،اختصار اور صنعتوں کا استعمال اس کی سب سے بڑی خوبی ہے لیکن بعض خامیاں بھی اس میں پائی جاتی ہیں ،اس کی خوبیوں اور خامیوں کو اس قدر زیر بحث لایا گیا کہ اردو ادب کی تاریخ کا سب سے بڑا معرکہ یعنی ''معرکہ شرر و چکبست'' وجود میں آگیا تھا۔

ان شعراء کے بعد جب سرسید اور حالی کی کوششوں سے اردو نثر اور نظم کے دھاروں کا رخ بدلنے لگا اور جدید رجحانات کو اہمیت حاصل ہونے لگی تو حالی ،محمد حسین آزاد۔اسماعیل میرٹھی کی مثنویاں ایک علیحدہ ہی آب و تاب کے ساتھ منظر عام پر آئیں ۔حالی کی حب وطن اور برکھات ،شبلی کی صبح امید اور اسماعیل میرٹھی کی چھوٹی چھوٹی مثنویوں میں زندگی کے حرکی ہونے کا تصور ،جدلیت کا شعور ،حب وطن کا راست اظہار اور دقیانوسی خیالات سے بغاوت ان کا نمایاں وصف ہے۔

حفیظ جالندھری کے ''شاہنامہ اسلام'' اقبال کا ''ساقی نامہ'' مشہور مثنویاں ہیں ۔ترقی پسند تحریک کے فروغ کے دوران بھی مثنویاں لکھی جاتی رہی ہیں۔علی سردار جعفری کی مثنوی ''جمہور'' اس دوران کی بہترین مثال ہے۔جس میں انہوں نے شہنشاہیت اور عوام کی رسا کشی کا ذکر کر کے انقلاب کی اہمیت اجاگر کی ہے اور ایک حسین دنیا کی تعمیر کے خواب جگائے ہیں اسی طرح کیفی اعظمی وغیرہ ترقی پسند شعراء نے مثنوی کی روایت کو اپنے دور میں زندہ رکھا۔موجودہ دور تک آتے آتے مثنوی نگاری کی روایت ماند پڑ گئی ہے ،صرف اکا دکا مثنویاں کہیں کہیں نظر آتی ہیں۔

7 خلاصہ :

سوائے مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کے دوسری تمام ابتدائی مثنویاں سماجی فلاح و بہبود اور خاص مسلک کی تبلیغ یا صوفیانہ خیالات کی اشاعت کے لئے وجود میں آئی تھیں۔

حضرت شمس العشاق کی خوش نامہ ۔یا خوش نغز ،وغیرہ اس کی مثالیں ہیں ۔جب زبان و بیان کا دامن وسیع ہونے لگا تو بتدریج موضوعات کا دائرہ پھیلتا گیا اور ترجمے کی صورت میں بھی مثنویاں لکھی جانے لگیں۔زندگی کے تمام شعبے مثنوی نگاروں کی فکر و فن کا مرکز بن گئے اس مرحلے میں کئی طویل داستانی مثنویاں لکھی گئیں مثلاً میر حسن کی سحر البیان یا وجہی کی قطب مشتری یا نصرتی کی گلشن عشق وغیرہ۔

مثنویاں تاریخ کے مختلف ادوار کی معاشرتی ،تہذیبی اور ادبی قدروں کی نمائندگی کرتی ہیں ۔یہ محض روایتی قصے اور فرضی کہانیاں نہیں میر حسن پہلے شاعر ہیں جنہوں نے طبع زاد قصے سحر البیان کے ذریعے جاگیردارانہ طبقے کی معاشرت کی مکمل تصویر پیش کی ہے۔

مثنوی سحر البیان کا آغاز حمد ،نعت اور منقبت سے متعلق اشعار کے سلسلے سے ہوتا ہے جو مثنوی کی روایت کے عین مطابق ہے اس حصہ سے اس وقت کے مذہبی اقتدار اور عقائد کی جھلک ملتی ہے۔

ہے اور کہیں کوئی جھول نہیں ہے بیان میں ایسا تسلسل ہے جو مفہوم کے سمجھنے میں کوئی الجھن پیدا ہونے نہیں دیتا۔ یہ ایک طبع زاد قصہ ہے جو ہند آریائی قصوں پر مبنی ہے۔ سینہ بہ سینہ کئی قصوں میں بادشاہوں کے بے اولاد رہنے، نجومیوں کی پیشن گوئیوں کے مطابق صاحب اولاد بن جانے، کسی شہزادی، کسی جن یا پری کے سائے میں آجانے جیسے تو ہمات یا شہزادے یا شہزادی کا قید میں پھنس جانے یا ان کے دوستوں کا بھیس بدل کر مدد کے لیے نکل پڑنے کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ اس طرح سحر البیان میں کہانی یا پلاٹ کے اعتبار سے کوئی جدت نہیں پائی جاتی لیکن کردار نگاری، جذبات نگاری، سراپا نگاری، منظر نگاری اور زبان و بیان میں مصنف نے جس فنکاری سے کام لیا ہے اور تہذیبی اقدار و ثقافتی مظاہرہ کی رنگا رنگ دنیا آباد کی ہے، لافانی اہمیت اور شہرت کا باعث بن گئی ہے۔

میر حسنؔ نے کردار نگاری کے اعتبار سے سحر البیان میں کمال مہارت کا مظاہرہ کیا ہے، مثنوی میں سب سے پہلے ہم بادشاہ کے کردار سے متعارف ہوتے ہیں، اس کے بعد کہانی کے ہیرو بے نظیر کا کردار آتا ہے، اس کے علاوہ کہانی کی ہیروئن بدر منیر اس کی سہیلی نجم النساء ،ایک پری ماہ رخ اور جنون کے شہزادہ فیروز بخت کے کردار سامنے آتے ہین ان کے علاوہ کنیز اور رقاصاؤں وغیرہ کے کردار بھی ملتے ہیں۔

تمام کرداروں کے حلیے ،ان کے اعتقادات، جذبات اور عقل و شعور کو پیش کرنے میں میر حسنؔ نے انتہائی مہارت اور فنکاری سے کام لیا ہے۔ بادشاہ کی کردار نگاری میں اس ماحول اور معاشرت کی پوری عکاسی کی گئی ہے۔

ہیروئن بدر منیر کے ذریعے بھی شاہانی ماحول کی عکاسی کی گئی ہے، وہ بھی عشقیہ جذبات سے مغلوب ہے۔ اپنی سہیلی نجم النساء کے ایک اشارے پر بے نظیر کو دعوت ناؤ نوش دیتی ہے، کہانی کے کسی مرحلے پر اس میں تہذیب و شرافت کی جھلک نہیں ملتی، اس کے کردار کی صرف یہ خوبی ہے کہ وہ عشق میں وفاداری اور پائیداری برتتی ہے۔

نجم النساء، جو وزیر زادی ہے اور بدر منیر کی سہیلی بھی ہے حرکت و عمل کے اوصاف کا نمایا پیکر ہے۔ کہانی کے دوسرے کرداروں کے بے عمل اور جمود کے برخلاف اپنے مشوروں اور اپنی حرکتوں سے کہانی کو جاندار اور دلچسپ بنادیتی ہے۔

میر حسنؔ نے تمام کردارروں کے حلیے ،ان کے اعمال و افعال اور اعتقادات کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

مثنوی میں جب کرداروں کے لباس اور وضع قطع کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس زمانے کے رہن سہن اور ملبوسات و زیورات وغیرہ کی تفصیلات سے ہمیں روشناس ہونے کا موقع ملتا ہے مثلاً ''شہزادی'' کے بارے میں میر حسنؔ کا بیان ہے:

کروں اس کی پوشاک کا کیا بیاں
فقط ایک پشواز آب رواں
زبس موتیوں کی تھی سنجاف کل
کہے تو وہ بیٹھی تھی موتی میں تل

جسے دیکھ شبنم کو آوے حجاب
وہ کرتی میں انگیا جواہر نگار
نیا باغ اور ابتداء بہار

جذبات نگاری۔ میر حسؔن کو کمال مہارت حاصل ہے، رحم ہو یا قہر، نفرت ہو یا محبت، رشک ہو یا رقابت، عشق ہو یا رقابت ہر طرح کے جذبات کو مناسب موقع پر انہوں نے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً جب شہزادہ بارہ برس کی عمر کو پہنچتا ہے اور اس کی شاہی سواری جلوس کے بعد بخیر و عافیت محل واپس آتی ہے تو خوشی کے مارے محل کے اندر جس طرح کا اظہار کیا جاتا ہے اس کی عکاسی میر حسن نے بڑی بی کے ساتھ کی ہے۔

جہاں تک کہ تھیں خادمان محل
خوشی سے وہ ڈیوڑھی تک آئیں نکل
قدم اپنے حجروں سے باہر نکال
کیا سب نے آپیشوا حال حال
بلائیں لگیں لینے سب ایک بار
کیا جی کو یکدست سب نے نثار

منظر نگاری میں بھی حسن میر حسؔن کو حد درجہ کامیابی حاصل ہے، اس مثنوی میں منظر نگاری کے ان گنت مواقع آئے ہیں اور مصنف ہر جگہ اپنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ اس طرح مثنوی ''سحر البیان'' اردو مثنوی کے فن کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔

8 مشق کے سوالات :